زِنداںؔ نامہ

فیض احمد فیض

مکتبہ کارواں کچہری روڈ ۰ لاہور

زنداں نامہ

فیض احمد فیضؔ

مکتبۂ کارواں ۰ کچہری روڈ ۰ لاہور

مندرجات

سرآغاز

سیّد سجّاد ظہیر

مقدمۂ سازش" راول پنڈی کے دنوں میں فیض کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل (حیدر آباد سندھ) میں تھا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء تک ہمارے مقدمے کی سماعت ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں روز روز اسپیشل ٹریبونل کے اجلاس میں جا کر ملزموں کے کٹہرے میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اس دوران گواہوں کی شہادتوں، وکیلوں کی جرح اور بحث اور معزز ججوں کی فاضلانہ قانونی موشگافیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہم امید و بیم کے عالم میں تھے۔ "چھٹی" وافر تھی۔ انھیں دنوں ایک دن یہ

اطلاع ملی کہ "دستِ صبا" شائع ہوگئی۔ گو ہم اس کی تمام چیزیں فیض کے منہ سے سُن چکے تھے، اور انھیں بار بار پڑھ چکے تھے، لیکن اس خبر سے ہم میں سے تمام ان قیدیوں کو جو ادب سے مَس رکھتے تھے، ایک غیر معمولی مسرّت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ہم نے ایک پارٹی بھی کر ڈالی جس میں ہم تمام قیدیوں نے مل کر فیض کو "دستِ صبا" کی اشاعت پر مبارکباد دی۔ اس موقع پر منجملہ اور باتوں کے میں نے یہ کہا تھا کہ بہت عرصہ گذر جانے کے بعد، جب لوگ راولپنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مؤرخ سنہ ۱۹۵۲ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔

بہت دنوں سے لوگ، جن میں بعض نیک اندیش اور بعض بداندیش ہیں، اردو ادب، اور خاص طور پر اس کی ترقی پسند صنف پر جمود طاری ہونے یا اس کے انحطاط کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس

نقطۂ نظر کو صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اُردو ادب کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دور تقریباً ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ابھی تک جاری ہے اور اگر ہم گزشتہ چار پانچ سال کو ہی لے لیں تو میرے خیال میں فیض کی "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" ندیم قاسمی کی "شعلۂ گل" سردار جعفری کی "پتھر کی دیوار"، احتشام حسین کی "تنقید اور عملی تنقید" اور مجنوں گورکھپوری کی "نقوش و افکار" (منجملہ دیگر کتابوں کے) اس دعویٰ کی شہادت میں کافی ہیں کہ تخلیق کا سرخ شعلہ

"جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی"

نامساعد حالات میں نہ دھیما ہوتا ہے اور نہ بجھتا ہے بلکہ جہل و رجعت کی کالی آندھیاں اُسے اور بھی بھڑکاتی ہیں اور اس طرح مجاھدہ اور تصادم کے طوفانوں سے گزر کر اور اس پیکار سے قوت و حرارت حاصل کر کے حق و صداقت کا نور پہلے سے بھی زیادہ درخشاں ہو جاتا ہے اور اس کے حسن اور تاثر میں صد رنگ نئی تابندگیاں جھلملانے

لگتی ہیں۔

"زنداں نامہ" کی بیشتر منظومات فیضؔ نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔ یعنی جولائی سنہ ۱۹۵۳ء سے مارچ سنہ ۱۹۵۵ء تک کی لکھی ہوئی چیزیں اس میں ہیں۔ اس درمیان میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے کیونکہ ہم دونوں کو چار چار سال قید بامشقت کی سزا دینے کے بعد' اہلِ اقتدار نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ایک ساتھ جیل میں نہ رکھے جائیں۔ فیضؔ کو پنجاب میں منٹگمری جیل کو بھیجا گیا اور مجھے حیدرآباد سندھ سے بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ کو۔ ہم ایک دوسرے سے خط وکتابت بھی نہ کر سکتے تھے۔ تاہم دوسرے دوستوں کے خطوں اور بعض اردو رسالوں کے ذریعے مجھے فیض کی چند غزلیں اور نظمیں جو اس زمانے میں لکھی گئیں' پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اب کہ حالاتِ زندگی میرے لیے کافی خوشگوار ہیں اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں' اس کے باوجود جب میں اُن ذہنی

جذباتی اور روحانی کیفیات کا خیال کرتا ہوں، جو مجھ پر اس وقت طاری ہوتی تھیں جب اپنے اس محبوب ترین دوست اور ہمدم کا کلام پڑھتا تھا تو اس کا اظہار مشکل معلوم ہوتا ہے۔ شاید بے لاگ تنقید کے لیے یہ اچھا بھی نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ ہمارے بہت سے تجربے، زندگی اور اپنے وطن کو ثمر بار اور حسین بنانے کے متعلق ہمارے خواب، ہمارا درد، ہماری نفرتیں اور رغبتیں مشترک تھیں، اس لیے فیض کے ان اشعار سے میں غیر معمولی طور پر متأثر ہوتا تھا۔ اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصّہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو اتنی فیاضی سے مرصع کر دیتا ہے، اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے، تو کبھی میرا ذہن اس کی تخیل کی اُن شاداں اور فرحاں گل کاریوں سے کسب شعور کرتا جہاں جدید جدلیاتی علم کی ضیاپاشیاں، انسانیت کے

شریف ترین جذبات سے اس طرح مل گئی ہیں جیسے شعاعِ مہر سے تمازت۔

فیضؔ کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اُن اقدار کا تعلق ہے، جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے، وہ تو وہی ہیں جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں، لیکن فیضؔ نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدّن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت، اس کا نرم، شیریں اور مترنّم اندازِ کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوا ہے۔ اُس کے متحرک اور رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے، اُس کے خیالات میں اُن سچائیوں اور ان جمہوری مقاصد کی چمک جن سے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کے دل روشن ہیں۔ اگر تہذیبی ارتقا کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کر کے اپنے دلوں

میں گداز، اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار میں استقامت و رفعت پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے، بیرونی اور اندرونی طور پر مصفّا بھی ہو اور معطّر بھی؛ تو فیض کا شعر غالباً ان تمام تہذیبی مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس کی غیر معمولی مقبولیّت کا سبب یہی ہے۔ البتہ فیض کے تمام چاہنے والے، نقشِ فریادی، دستِ صبا اور زنداں نامہ کے شیدا ہونے کے باوجود اُن سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ان کی وہ تخلیقیں جو ابھی نہیں ہوئیں، ان کے مقابلے میں، جو کہ وہ کر چکے ہیں، زیادہ گراں قدر ہوں گی۔

لکھنؤ۔ ۱۳ جنوری سنہ ۱۹۵۶ء سجّاد ظہیر

رُوداد قفس

سابق میجر محمد اسحٰق

کیمیا گر بغصہ مردہ بہ رنج
ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

فیض صاحب کی کسی تصنیف کا دیباچہ لکھنے کی سعادت ایک خزانہ پانے سے کم کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی دقتوں کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب لکھنے بیٹھا۔ کہتے ہیں پرانے زمانے کے راجے مہاراجے جب کسی برگشتہ بخت سفید پوش کی پریشاں حالیوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے تو اسے ایک عدد ہاتھی بخش دیا کرتے تھے۔ معاملہ بعینہٖ ایسا تو

نہیں ہے، لیکن ایک سیدھے سادے فوجی آدمی کے لیے فیض کے کلام کے بارے میں کچھ لکھنا کافی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے اور پھر ایک کسان اور خاص کر نوآبادیاتی ملک کے کسان کے بیٹے کی تربیت ہی کیا ہوتی ہے! دیہاتی سکولوں کی تعلیم اور وہ بھی توہم پرستی اور جہالت کے گھناؤنے سایوں تلے، ایسے ماحول میں جس میں غربت و ناداری کے طفیل پڑھنے لکھنے کی نسبت ہل کی لکیر سیدھی رکھنا، ڈھور ڈنگر کی نگہبانی کرنا اور بیلوں کے لیے چارہ لانا زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جہاں ہر نئی شے اور ہر نئے خیال کا خفت آمیز تمسخر اُڑایا جاتا ہے، جہاں دنیا کا بلند ترین خیال اور پاکیزہ ترین جذبہ دو بیگھہ زمین کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے — میرا تعلیمی پس منظر ایسا ہی تھا۔ فنونِ لطیفہ میرے اساتذہ کے بس کی بات نہیں تھے، میرا ان سے مَس کیا ہوتا۔ کتابیں زندگی کا حصہ نہیں تھیں، صرف امتحان پاس کرنے کا ذریعہ تھیں۔ لائبریریاں، علما کی محفلیں، علمی مباحثے، مشاعرے، ڈرامے، موسیقی، رقص،

آرٹ گیلریاں، میوزیم سب مفقود۔ اور چاروں طرف سامراجیوں اور ان کے ملکی ایجنٹوں کے اقتصادی بوجھ تلے کراہتی ہوئی مخلوق!

ایسی روکھی پھیکی تعلیم کے بعد آٹھ دس سال کی فوج کی "صاحب بہادری" نے رہی سہی کسر نکال دی۔ وہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ اور "کالا لوگ" کی دوسری زبانوں کو اپنے دیس میں ہی دیس نکالا ملا ہوا تھا یا ان کی حیثیت انگریزی زبان کی لونڈیوں باندیوں کی سی تھی۔ جیل کے چار سال اس لحاظ سے مفید رہے کہ یکسوئی سے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ دو ایک پروفیسر بھی ساتھ ہی قابو آ گئے تھے۔

زنداں نامہ کا دیباچہ لکھنے کے بہانے میں اپنی سوانحمری لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی مشاہدے کی صحیح جانچ اسی وقت ہو سکتی ہے جب شاہد کے مقام اور اس کی صلاحیتوں کا پورا پورا تعین کر لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں کچھ مہینے کم چار سال دن رات فیض کے ساتھ رہا ہوں۔ یہ طویل عرصہ ہم نے جیل کے ایک ہی

احاطے میں ملحقہ کوٹھڑیوں میں گزارا ہے، سیکڑوں مرتبہ صبح سویرے سب سے پہلے ایک دوسرے کے منہ لگے ہیں، اپنی خوشیاں اور غم باہم بانٹنے پر مجبور رہے ہیں۔ جیل کے باہر آدمی سیکڑوں لوگوں کو روزانہ ملتا ہے ــ ملتا نہ بھی ہو دیکھ ضرور لیتا ہے۔ کئی قسم کی آوازیں سنتا ہے، بیسیوں مناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی سے نفرت ہے تو کنّی کترا کے نکل سکتا ہے، کسی سے محبّت ہے تو ملاقات کی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے یا ان کی تلاش میں جی بہلا لیتا ہے۔ جیل میں آدمی کی مرضی اس سے چھین لی جاتی ہے اور اس کی نقل و حرکت محدود کردی جاتی ہے۔ وہاں کی کائنات دو چار قیدی، دو چار پہرے دار، کچھ کوٹھڑیاں اور کچھ دیواریں، ایک آدھ درخت، ایک دو گلہریاں، نصف درجن کے قریب چھپکلیاں اور کچھ کوّے اور دوسرے پرندے ہوتے ہیں، جن میں مہینوں بلکہ سالوں تک تبدیلی نہیں آتی۔ مجھے اس چھوٹی سی دنیا میں فیض صاحب کے ساتھ مسلسل چار سال تک رہنے کا موقع

ملا ہے۔ لیکن اس طویل قرب کے باوجود ضروری نہیں ہے کہ میں اپنے موضوع سے پورا انصاف کر سکوں۔ ایک اندھا کائنات کی رنگا رنگی میں عمر گزار کر بھی رنگوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کئی لوگ اچھی بھلی نظر رکھتے ہوئے بھی بعض رنگوں کو نہیں پہچان سکتے۔ ریڈیو پروگرام سننے کے لیے طاقتور ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں چاہیے ریسیونگ سٹ بھی نقائص سے پاک ہونا چاہیے۔

یہاں پر زنداں نامہ کی نظموں اور غزلوں پر تنقید و تبصرہ اگرچہ میرا مقصود نہیں، پھر بھی شاعر کے بیان میں ان کا ذکر ناگزیر ہے فیض کی لطافت کا بیان میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اثرؔ لکھنوی کی زبان میں "فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطۂ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ تخیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول، ایک

طلسمی فضا میں اس طرح مستِ پرواز ہے کہ ایک پر ایک کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور قوسِ قزح کے عکاس بادلوں سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے....'' ہر کوئی بقدرِ ظرف اس لطافت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فہم کے مطابق، چیدہ چیدہ نظموں کا پس منظر بیان کر دوں۔ اتنا خیال رہے کہ صحیح ادب اپنے پس منظر کی حدود و قیود کو توڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے۔ فیض کی شاعری کو اس کے پس منظر کے سانچے میں محدود کر کے دیکھنا ظلم ہے۔ اس لیے میری کاوشوں کو ایک سائن بورڈ سے زیادہ حیثیت نہیں دینی چاہیے۔ آگے راستہ سب کا اپنا اپنا ہے اور اپنی اپنی ہمت۔

فیض صاحب ۹ ؍مارچ ۱۹۵۱ء کو قید ہوئے اور اپریل ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے۔ اس طرح ان کی اسیری کے دن کچھ اوپر چار سال بنتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ پہلے تین مہینے سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں قیدِ تنہائی میں رہے۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۵۳ء تک حیدر آباد (سندھ)

جیل میں راولپنڈی سازش کیس کے باقی اسیروں کے ساتھ رہے۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں ہم سب کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر لاہور، منٹگمری، مچھ (بلوچستان) اور حیدرآباد کے جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ فیض صاحب کے لیے میرے اور کیپٹن خضر حیات کے ہمراہ منٹگمری سنٹرل جیل کا انتخاب کیا گیا۔ لیکن وہ چونکہ بغرضِ علاج کراچی چلے گئے تھے، اس لیے کہیں ۱۹۵۳ء میں جا کر ہمارے پاس منٹگمری پہنچے۔ یہاں سے ہم اکٹھے رہا ہوئے۔

مجھے فیض صاحب کی گرفتاری کے کوئی تین ماہ بعد مئی ۱۹۵۱ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس لیے خلقِ خدا کی سرگوشیاں سنتا رہا۔ فیض صاحب کے ساتھ اس دوران میں ان کے عزیزوں دوستوں کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ ہی وہ کسی سے خط و کتابت کر سکتے تھے۔ ان کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں اور قید میں ان کے ساتھ سلوک کے بارے میں عجیب عجیب دلخراش قصے مشہور تھے۔ جب پہلی بار ان سے حیدرآباد جیل میں ملاقات ہوئی تو بارے اطمینان ہوا۔ وہی خندہ پیشانی

وہی چمکتی ہوئی آنکھیں، وہی گوتمی مسکراہٹ جس کا نور سب طرف پھیل رہا تھا اور پھر وہ فاتح عالم محبت، جس سے ان کے جاننے والے مانوس ہیں۔

جیل ایک طرح کا طلسماتی آئینہ خانہ ہوتا ہے جہاں صورتوں کے نہیں سیرتوں کے عکس عجیب و غریب شکلیں بنا کر ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی کی طبع جھگڑے کی طرف مائل ہے تو وہ ہر کسی سے لڑائی مول لینے کی فکر میں ہوگا۔ کوئی بزدل طبیعت کا ہے تو وہ گوبر کے کیڑے کی طرح ہر وقت سر چھپانے کی دھن میں ہوگا۔ کسی کے مزاج میں قنوطیت ہے، تو وہ ہر اچھی بُری خبر سے اپنی دل شکنی کے اسباب ڈھونڈ لائے گا۔ کسی کو کوئی خبط ہے تو وہ دیوانگی کی حد تک ترقی کر جائے گا۔ طبیعتوں میں کمینگی اور تنگ نظری خاص طور پر پھلتی پھولتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے ساتھیوں اور جیل والوں سے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انسان کی ساری کائنات جیل کی چار دیواری میں محدود کر دی جاتی ہے اور اس کے فکر و نظر میں تنگی آ جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں

پر حیوانی بندشیں عائد کر دی جاتی ہیں۔ کوٹھڑی میں بند کرنا، ایک احاطے میں محصور کر دینا، بیڑیوں کا استعمال، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات پر پابندیاں، بے بسی کا عالم، یہ سب چیزیں اسیروں کے دل پر نوکِ سوزن کا کام کرتی ہیں۔ جیل کے بعض افسر بھی قیدیوں کی دل شکنی کے مواقع ڈھونڈتے رہتے ہیں اور قیدی کی عزّتِ نفس اور وقار کو ٹھیس پہنچانے میں خاصے ماہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات سب کے بارے میں صحیح نہیں۔

ان حالات میں ایک آدمی قید ہو کر اگر اپنی روزمرّہ کی شخصیت قائم نہ رکھ سکے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کمال ان لوگوں کا ہے جو جیل جا کر بھی وضعداری قائم رکھ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو میں جیل جانے سے پہلے جانتا تھا ان میں فیض صاحب ہی ایسے تھے جو بظاہر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لیکن عام لوگوں کی طرح طبیعتوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے لڑائی جھگڑے دنگہ فساد اور اسی قسم کے دوسرے سیفٹی ویلو (SAFETY VALVE) استعمال نہ کرنے سے فیض صاحب پر جو ذہنی اور جسمانی فشار پڑا وہ ان کے دوستوں

سے مخفی نہیں۔ شاعری غنیمت تھی، جس کے ذریعے دل کا غبار نکال لیا کرتے تھے۔ لیکن شاعری بذاتِ خود دل و جگر کے ایندھن پر جلا پاتی ہے ؎

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!

حیدر آباد میں دورانِ مقدمہ کے دن بھی عجیب دن تھے۔ تین مہینوں سے ٹوڈی قسم کے لوگ اخباروں، اشتہاروں، جلسوں، جلوسوں میں ہمیں گولی کا نشانہ بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بعض اخباروں نے غدار نمبر نکال ڈالے تھے۔ کچھ اس قسم کا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ ملک میں ہر مردِ آزاد یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کو بھی سازش میں دھر لیا جائے گا۔ چاروں طرف ایک دہشت اور سراسیمگی کی فضا تھی اور ہمارے رشتہ دار اور دوست ہماری جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن جیل کے اندر ہماری اپنی یہ حالت تھی کہ گویا کسی پک نک پر آئے ہوئے ہیں۔ سب طرف ہنسی مذاق تھا، قہقہے تھے، امید تھی، حوصلہ تھا۔ قوالیاں ہوتی

بھیس سوانگ بھرے جاتے تھے! اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیں اپنی بریت پر بھروسہ تھا اور دوسری شاید یہ ہو سکتی ہے کہ بہت بڑے خطرے کے سامنے آدمی عموماً دو ہی راستے اختیار کرتا ہے یا تو الٹے پاؤں بھاگ اٹھتا ہے یا مقابلے کی ٹھان لیتا ہے۔ مؤخرالذکر کی بھی آگے دو صورتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم میں بعض ایسے بھی ہوں گے جو مصائب کی ہولناکیوں کے روبرو لرز لرز کر ہنس رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے کہ

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہ صورتِ حال حیدرآباد سے مخصوص نہیں تھی، لاہور کے چند روز کے قیام میں بھی ہماری یہی حالت رہی تھی۔ چنانچہ لاہور کی برڈووڈ بیرکس (BIRDWOOD BARRACKS) میں پولیس کی تحویل میں دئے جانے کے کوئی پانچ منٹ بعد مئی ۱۹۵۱ء میں گرفتار ہونے والے ساتوں کے ساتوں فوجی افسر ظفراللہ پوشنی کی قیادت

میں فضول قسم کے فوجی کورس (CHORUS) الاپ رہے تھے (اس قسم کی بے ضرر لغویات کی چھوٹے فوجی افسروں کو خاص موقعوں پر اجازت ہوتی ہے)۔ لاہور جیل کا ایک واقعہ یاد کرتا ہوں تو اب بھی ہنسی آجاتی ہے۔ وہاں ہمیں بم کیس وارڈ (BOMB CASE WARD) میں رکھا گیا (یہ وارڈ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے لیے خاص طور پر تعمیر کیا گیا تھا)۔ اس کے صحن میں ایک بارہ دری سی ہے، جس کے دروازوں میں لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی ہے۔ رات کو ہم یہیں سویا کرتے تھے۔ ایک دن سونے کی تیاری میں تھے کہ ایک بوڑھا سنتری جالی سے لگ کر اندر جھانکنے لگا۔ خضر حیات نے پوچھا۔ بابا تمھیں ہم قید میں دکھائی دیتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں جناب۔ خضر حیات بولا لیکن بابا ہمیں تو تم قید میں نظر آتے ہو۔ اس پر بوڑھا سنتری پہلے تو بوکھلا سا گیا۔ پھر اس زور سے ہنسنے لگا کہ ہم بھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ایک نشہ تھا جس میں سب مگن تھے۔

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

لاہور ہی کا ایک اور لطیفہ یاد آگیا۔ ایک دن ہمیں ریمانڈ کے لیے عدالت میں لے جایا جانا تھا۔ اطلاع ملی کہ سیّد سجاد ظہیر بھی ساتھ جائیں گے۔ جیل کے بڑے دروازے کے اندر پولیس کی قیدی ڈھونے والی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم وہاں رک گئے اور سیّد صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں پھانسی کی کوٹھیوں کی طرف سے سفید شلوار کرتے میں ملبوس، سر پر جناح کیپ جمائے، ایک بھاری بھرکم، زندگی سے مطمئن شخص آتا دکھائی دیا۔ ہمارے درمیان چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ کیا یہ سجاد ظہیر ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے ان کے ساتھ کسی کی بھی جان پہچان نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کمیونسٹ نہایت قبیح صورت، درندہ سیرت انسان ہوتے ہیں۔ داہنے بائیں پستول لگاتے ہیں۔ پیٹ پر پیش قبض باندھتے ہیں بڑی بڑی مونچھیں اور خونخوار آنکھیں رکھتے ہیں۔ اور ان کا

موضوعِ سخن قتل و غارت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سجّاد ظہیر چونکہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے، اِس لیے ان لوگوں کے خیال میں ان کے منہ سے ہر سانس میں آگ نکلنی چاہیے تھی۔ اور ان کو اس قسم کا کاٹیاں انسان ہونا چاہیے تھا کہ ڈبکی لگائے تو جیل سے باہر چلا جائے یہ شخص جو نرم چال، پاکیزہ خد و خال اور ایک عدد عالمانہ توند لیے ہوئے تھا سجاد ظہیر کیسے ہو سکتا تھا۔ ہمارے یہ ساتھی اپنی رائے پر اس شدّت سے مصر تھے گویا یہ ان کا جزوِ ایمان ہے۔ چنانچہ چار و ناچار ہم سب نے تسلیم کر لیا کہ یہ سجّاد ظہیر نہیں ہو سکتے، کشمیری بازار کے شیخ ہوں گے یا پولیس کے کوئی خضر صورت ایجنٹ۔ چنانچہ عدالت تک تمام سفر میں ہم گم سم بیٹھے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے رہے۔

عدالت میں جب وہ کھڑے ہو کر گرجے کہ "جناب والا پندرہ دن ہو گئے۔ ہیں اور مجھے ابھی تک نہیں بتایا گیا کہ میں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں۔ یہ بالکل لغو (PREPOSTEROUS) بات ہے"، تو ہمیں یقین ہو گیا

کہ وہ سجاد ظہیر ہیں۔ ریمانڈ کے لیے ہمیں جج صاحب کی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا وہاں پولیس گاردوں اور گاڑیوں کی اتنی گہما گہمی تھی کہ کوٹھی کی اوپر کی منزل میں بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ضیاء الدین نے اشارے سے مجھے بلا کر کہا، "بھئی ایسے بیٹھے ہو جیسے مویشی چرانے آئے ہو۔ سیدھے ہو کر بیٹھو۔ کالر ٹھیک کرو۔ ذرا ذرا مسکراؤ۔ دیکھتے نہیں ہو پبلک دیکھ رہی ہے" اور خود بھی تن کر ایسے بیٹھ گیا کہ گویا تصویر اُتروانے آیا ہو۔ ایرکموڈور جنجوعہ سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ انھوں نے مصافحہ کرتے وقت میرے ہاتھ کو اس پھرتی سے نچوڑا کہ اب تک یاد ہے۔

حیدرآباد میں عدالت کی عمارت جیل کے اندر تھی۔ عدالت کا وقت آٹھ سے بارہ بجے تک ہوتا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کے دن خالی ہوتے تھے۔ شام کے وقت کبھی کبھی ہمارے وکلاء مشورے کے لیے

آجایا کرتے۔ باقی وقت ہمارا اپنا ہوتا تھا۔ ایک ہی احاطے میں سب کے لیے جگہ نہیں تھی اس لیے فیض صاحب، محمد حسین عطا، جنرل اکبر خاں، بریگیڈیر صادق خاں، کرنل ضیاء الدین، کرنل نیاز محمد ارباب، میجر حسن خاں، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی، کیپٹن خضر حیات اور میں ایک احاطے میں احاطے میں رکھے گئے اور سید سجاد ظہیر، جنرل نذیر احمد، ایر کموڈور جنجوعہ اور بریگیڈیر لطیف خاں کو ایک دوسرا احاطہ دیا گیا۔ بیگم اکبر خاں کے لیے علیحدہ انتظام تھا۔ کھانے کا بندوبست ہماری طرف تھا۔ ہمیں ظہور احمد اور آدل خاں دو قیدی نہایت اچھا کھانا پکانے والے ملے ہوئے تھے اور کھانے کا انتظام ایک باقاعدہ آفیسرز میس (OFFICE RS' MESS) کی طرز پر تھا۔ جس کا سیکرٹری گاہے گاہے چنا جاتا تھا۔ شام کے وقت والی بال اور بیڈ منٹن بھی ہمارے احاطے میں ہی کھیلے جاتے تھے۔ چنانچہ مشترکہ سرگرمیوں کا مرکز یہی احاطہ تھا۔ مشاعرے، قوالیاں، ڈرامے عموماً یہیں ہوتے تھے۔ سید سجاد ظہیر والے

احاطے میں ہم چھٹی کے دن کی صبح کو جایا کرتے تھے جہاں کافی اور بسکٹ سے تواضع ہوتی تھی اور ادبی اور سیاسی گفتگوئیں ہوتی تھیں۔

مرزا سودا کے غنچے کی طرح فیض صاحب کی بیاض برداری کا کام میرے سپرد تھا۔ جب وہ مجلس مشاعرہ کی طرف یا سجاد ظہیر کے ہاں جاتے تو میں نوٹ بک اٹھائے پیچھے پیچھے ہوتا۔ دوسرے رفیق جب ہمیں اس طرح جلوس میں چلتا دیکھتے تھے تو چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس لیے کہ جیل میں فیض صاحب کے تازہ کلام کا ورودِ مسعود جشن سے کم نہیں ہوتا تھا اور پھر جس ادا سے ہم چلتے تھے، وہ بھی خوش طبعی کی ایک اچھی خاصی مزاحیہ صورت ہوتی تھی۔ فیض صاحب خراماں خراماں مسکراتے ہوئے، گھبرائے سے، شرمائے سے، چلتے تھے اور میں ایک لٹھ بند جاٹ کی طرح گردن اکڑائے، ناک آسمان کی طرف اٹھائے لوگوں کے سروں کے اوپر سے دیکھتا ہوا چلتا تھا اور جب تک فیض صاحب کے تشریف رکھنے پر نہایت مؤدب لیکن

باوقار انداز میں بیاض ان کی خدمت میں پیش نہیں کر لیتا تھا، مسکراتا تک نہیں تھا۔ میاں غنچہ اور مجھ میں اتنا فرق ضرور تھا کہ مرزا سودا جب کسی پر ناراض ہوا کرتے تھے تو غنچہ کو صرف قلمدان آگے بڑھانا ہوتا تھا۔ باقی میرزا خود بھگتا لیا کرتے تھے۔ یہاں یہ صورت تھی کہ فیض صاحب تو ہمیشہ سے "با دشمناں مروّت با دوستاں مدارا" کے قائل رہے ہیں اور روبرو کسی سے ناراض ہوتے ہی نہیں اور غنچۂ ثانی اُن دنوں دوست دشمن سب کی سرکوبی کو ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

حیدر آباد میں فیض صاحب، میں اور عطا ملحق کمروں میں رہتے تھے۔ میں اور عطا ان کے سب موڈوں سے واقف ہو گئے تھے۔ شعر کا عالم طاری ہوتا تھا تو فیض صاحب خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ البتہ اُٹھتے بیٹھتے گنگناتے ضرور رہتے تھے، کچھ عرصہ گنگنا چکنے کے بعد ادھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ ہم بھانپ لیتے تھے کہ سامعین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم دونوں کٹی کانفرنسوں اور لگاتار سرگوشیوں کے بعد موقع کی

مناسبت کا اندازہ لگا کر، گورو نانک دیوجی کے بھائی بالا اور مردانہ کی طرح حضورِ شاعر پہنچ جاتے تھے اور ادھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد غزل یا نظم کا مطالبہ شروع کر دیا کرتے تھے کہ اب بہت عرصہ ہو گیا ہے اور لوگ کیا کہیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اگر نظم یا غزل تیار ہوتی تھی تو ایک آدھ شعر سنا دیا کرتے تھے ورنہ حکم ہوتا کہ بھاگ جاؤ۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ اس انکار میں اقرار مخفی ہے اور بات پھیلا دی جاتی تھی کہ

معنی کی سرزمیں پہ نزولِ سروش ہے

ان کے نواح میں شور و غوغا، دنگا فساد، لڑائی جھگڑا، حتی الامکان بند کر دیا جاتا تھا۔ فیض صاحب نے بہت نازک طبع پائی ہے۔ ہمسائے میں تُو تُو میں میں ہو رہی ہو، دوستوں میں تلخ کلامی ہوئی یا یونہی کسی نے تیوری چڑھا رکھی ہو، ان کی طبیعت ضرور خراب ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی شاعری کی کیفیت کافور ہو جاتی ہے۔ جو لوگ عطا کو اور مجھے جانتے ہیں وہ زیرِ لب مسکرا رہے ہوں گے کہ یہ حضرات جن کو شاعری دیکھ پائے تو نثر

میں منہ چھپالے، فیض کی طبیعت پر کیونکر بار نہیں ہوجاتے تھے! اس کا بھید فیض صاحب ہی کھول سکتے ہیں۔

حیدرآباد میں قریباً ہر پندرھواڑے ایک مجلسِ مشاعرہ منعقد کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔ یہ مشاعرہ کبھی طرحی ہوتا تھا کبھی غیر طرحی اور سبھی کو اس میں حصّہ لینا پڑتا تھا۔ "دستِ صبا" میں مندرجہ ذیل مصرعوں پر کہی ہوئی غزلیں موجود ہیں:

۱۔ "ذکر مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں"

۲۔ "آج کیوں مشہور ہے ہر ایک دیوانے کا نام"

۳۔ "دیکھنا وہ نگہِ ناز کہاں ٹھہری ہے"

۴۔ "ورنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں"

فیض کی غزل "وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں" — حسرت موہانی کی ایک غزل پر کہی گئی ہے۔

میرے ذہن میں فیض صاحب کی جیل کی شاعری کے چار رنگ ہیں (یا موڈ کہہ لیجیے) - پہلا رنگ سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں ان کی تین مہینوں کی قیدِ تنہائی کا ہے - وہ بہت مشکل دن تھے - کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار، خطوط سب چیزیں ممنوع تھیں - انھوں نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے :

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

صرف ایک شمس الدین[1] تھے جو نوابوں، جنوں بھوتوں، دیووں، پریوں، عاملوں، معمولوں سے اپنے معاملات کے قصّے سنا کر فیض صاحب کا جی بہلایا کرتے تھے۔ حیدرآباد میں تو فیض صاحب ان کے ذکر سے

[1] شمس الدین 'سی' کلاس کے قیدی تھے جو ان کا کھانا تیار کیا کرتے تھے۔ یو۔پی کے رہنے والے تھے۔

بھرپور تھے۔ آج کل بھی اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ اس قیدِ تنہائی کا ان پر اتنا اثر ہوا تھا کہ حیدرآباد پہنچنے پر وہ اکیلا رہنے سے بہت وحشت کھاتے۔ اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے علاوہ ایک ہال بھی ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ ہمیں اجازت تھی کہ جہاں چاہیں بستر جمالیں۔ ہم اپنے اپنے کمرے میں رہنا چاہتے تھے، لیکن فیض صاحب ہال میں رہنے پر مصر تھے۔ کہتے تھے تمھیں میری طرح تنہائی میں رہنا پڑتا تو دوستوں کی صحبت کی قدر ہوتی لیکن ان پر یہ حالت زیادہ دیر طاری نہ رہی اور کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اب ان کا بیشتر وقت ہمیں اپنے کمرے سے نکالنے میں صرف ہوتا تھا۔

فیض صاحب کہا کرتے ہیں کہ اُن دنوں ان کی طبیعت میں بہت زوروں کی آمد تھی اور طرح طرح کے مضامین سوجھ رہے تھے۔ اس دوران کا کلام کچھ تو ان کے ذہن سے اتر گیا جو بچ گیا وہ "دستِ صبا" میں مندرجہ ذیل مندرجات پر مشتمل ہے:

متاعِ لوح و قلم

دامنِ یوسف

طوق و دار کا موسم (پہلا حصہ)

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام

کچھ کلام ایسا بھی ہے جو صرف سینہ بسینہ چل سکتا ہے اور جس سے فیض صاحب صرف مخصوص دوستوں کو نوازتے ہیں۔

ان کی شاعری کا دوسرا رنگ حیدر آباد کا ہے۔ یہاں ہمیں ہر طرح کا جسمانی آرام جو جیل میں ممکن ہو سکتا ہے، میسّر تھا۔

"گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

کی سی حالت تھی کہ ظاہری آرام و آسائش کے پردے میں ہزاروں حسرتوں کا خون اور لاکھوں تمناؤں کا قبرستان تھا۔ ہمارے خلاف کئی تعزیری دفعیں ایسی لگی ہوئی تھیں جن کی سزا موت تھی۔ اس کے ساتھ صفائی پیش کرنے کی سہولتیں بہت حد تک ہمیں میسّر نہیں تھیں۔ لیکن ہم نے سمجھ رکھا تھا کہ ؎

در بیاباں گر بشوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

اور وقتی طور پر شور و غوغا، ہاؤ ہُو، گالی گلوچ کے ذریعے آنے والے خطرے کی آہٹ کو دبائے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ دو سو سال ہمارا موضوعِ سخن صرف فتح رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے سامنے کسی نے کبھی شکست کا ذکر کیا ہو۔ ہم سمجھتے تھے کہ ایسا ذکر ایک دفعہ شروع ہو گیا تو روکے نہیں رُکے گا۔ ہم فوج کے اس مشہور مقولے پر عمل کر رہے تھے کہ جب مدافعت کی صورت نہ رہے تو دھاوا بول دو۔ چنانچہ شروع دن سے

ہم عدالت کے اندر حسبِ توفیق غلغلہ اندازی کرتے رہے۔ فیض صاحب نے اس میں بہت کم حصہ لیا۔ لیکن ہمیں کبھی روکا بھی نہیں۔ وہ اپنا جوش و ولولہ اپنے شعروں میں منعکس کر لیا کرتے تھے۔

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطا کار سرِ دار کھڑے ہیں

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گذری ہے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنّتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

دیکھنے والے دیکھیں گے کہ دستِ صبا کے دوسرے حِصّے

میں جوش و خروش کا وہ عالم نہیں جو پہلے نصف میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کچھ عرصہ مقدمہ کی سماعت ہو چکنے کے بعد ہمیں امید ہو چلی تھی کہ اگر عدالت کی کارروائی میں دلچسپی لیں تو شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس لیے سوچ بچار نے شوریدہ سری پر سبقت لے لی تھی۔ اس کی دوسری وجہ ان کے بھائی کی اندوہناک موت تھی۔ وہ حیدرآباد ان سے ملنے آئے تھے اور اپنے ایک روحانی پیشوا کی طرف سے ان کی رہائی کی خوشخبری لائے تھے۔ ابھی حیدرآباد میں ہی تھے کہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح کو نماز پڑھتے ہوئے اِس دنیا سے رحلت کر گئے۔ فیض صاحب کو اتنا صدمہ ہوا کہ مہینوں تک نیم مردہ حالت میں رہے۔ ایک دن تو چارپائی سے اترتے ہوئے بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑے۔ آواز سن کر میں اور عطا بھاگے بھاگے گئے اور زمین سے اُٹھا کر بستر پر لٹایا۔ یہ گھاؤ ابھی تک بھرا نہیں ہے، گو اُنھوں نے حسبِ عادت اسے کیموفلاج

(CAMOUFLAGE) کر لیا ہے۔

فیض صاحب کی کیمو فلاج کرنے کی عادت بھی عجیب ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ سگرٹ ختم ہو گئے لیکن بجائے اس کے کہ ساتھیوں سے مانگ لیں، بے قراری دور کرنے کے لیے احاطے کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ اس بے قراری کی تشخیص میں ہمیں کافی عرصہ لگا۔ ان کو چھپکلیوں سے بہت گھن آتی تھی۔ میرے خیال میں خوف بھی کھاتے تھے۔ ایک دن ہم سب برآمدے میں چارپائیاں ڈال کر سونے کی تیاری میں تھے کہ فیض صاحب نے دفعتاً اٹھ کر اِدھر اُدھر چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ عطا کی چارپائی پاس ہی تھی۔ اس نے سوچا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہاتھ کی طرف دیکھا تو سگرٹ سلگ رہا تھا۔ فیض صاحب کی نظروں کا پیچھا کیا۔ دیکھا کہ ان کی نظریں بار بار چھت کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ وہ چارپائی کے پاس آتے تھے اُوپر دیکھتے تھے اور آگے نکل جاتے تھے اور گھوم کر یہی عمل دُہراتے تھے۔ عطا نے چھپکلی کو دیکھ لیا اور اُٹھ کر فیض صاحب کی

کی چارپائی کھینچ کر ایک طرف کر دی۔

تیسرا رنگ کراچی کا ہے جہاں فیض صاحب دو ماہ کے لیے مقیم رہے۔ دراصل یہ رنگ دوسرے اور چوتھے کی درمیانی کڑی ہے کراچی ہسپتال میں فیض صاحب جیل کی نسبت قدرے آزاد فضا میں رہے۔ دوستوں کے ساتھ بغیر کسی قباحت کے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ وہاں انھیں بوجوہ آزادی کی نعمتوں کا شدت سے احساس ہوا۔ اِس شدید احساس کے بعد جب وہ منٹگمری آئے تو قید کا احساس بھی شدت پکڑ گیا اور ان کی شاعری میں ظاہر ہوا۔ اسی لیے انھوں نے کراچی اور منٹگمری میں لکھی ہوئی غزلوں اور نظموں کے مجموعے کا نام زنداں نامہ تجویز کیا ہے۔

کراچی میں فیض صاحب نے اپنی معرکۃ الآرا نظم "ملاقات" لکھی۔ اِس نظم کا پہلا بند اکتوبر ۱۹۵۳ء میں منٹگمری آ کر مکمل ہوا تھا اور دوسرا

اور تیسرا نومبر ہیں۔ لیکن میں اسے کراچی سے اس لیے منسوب کر رہا ہوں کہ وہ اس کے "جراثیم" کراچی سے لائے تھے۔ اس میں اسی ماہیٔ بے آب کی تڑپ ہے جس پر جانسوز محرومی کے بعد کچھ پانی چھڑک دیا گیا ہو اور وقتی سکون کے باوجود اُسے اس بات کا شدت سے احساس ہو کہ تھوڑا سا پانی جو اسے میسّر آیا ہے سوکھنے والا ہے۔ یہ نظم درد کی انتہائی شدّت کے ساتھ انتہائی تسکین کا بھی مظہر ہے۔ اس میں ایمان و ایقان کی جگمگاہٹ بھی ہے، اس میں انسانی حوصلہ، عزم اور حکمت کا راگ بھی گایا گیا ہے۔ ایسا حوصلہ، عزم اور حکمت جو صرف آج کے انسان کا طرّہ امتیاز ہیں جو دھرتی ماتا پر نہایت مضبوطی سے قدم جما کر تاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے اور مہتاب پر شبخون مارنے کی فکر میں ہے، جو پانی، ہوا، دریا، سمندر، برق و باراں اور کائنات کی دوسری پریوں اور دیووں کو مسخر کر چکا ہے یا ان کی تسخیر کیا چاہتا ہے، جس کی سیکڑوں، ہزاروں سالوں کی الم نصیبی اور جگر فگاری کے انبار

آج اس کے لیے حرکت اور حرارت کا منبع بنے ہوئے ہیں۔

فیض صاحب کی جیل کی شاعری کا چوتھا رنگ منٹگمری کا ہے۔ یہاں ہمیں کم و بیش حیدرآباد کی سی سہولتیں میسّر تھیں۔ جیل کے اربابِ اقتدار بھی نیک دل لوگ تھے، جو جیل کے قواعد و ضوابط سے سرِمو انحراف نہ کرنے کے باوجود ہماری دل شکنی نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان میں بعض اچھے ذوق کے لوگ بھی تھے جو ہمارے ساتھ ادبی چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ ایک صاحب کو تو ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ ان کے آنے کے کچھ ہی لمحوں کے بعد فیض صاحب طوطی کی طرح چہچہانے لگتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں نے ان پر کم گوئی کا الزام تراش لیا ہے، ان صاحب کو چرکیں سے لے کر مرزا غالب تک سب شعرا کے کچھ نہ کچھ بھلے بُرے شعر یاد تھے اور انھوں نے تیرتھ رام فیروزپوری کے ناولوں سے لے کر سعادت حسن منٹو کی کہانیوں تک سب پڑھ رکھا تھا۔ وہ آتے ہی علیک سلیک کے بعد شروع ہو جاتے اور فیض صاحب کی طرف سے

توجہ ہونے نہ ہونے کی پروا کیے بغیر یہاں سے وہاں، وہاں سے کہیں اور کچھ نہ کچھ کہتے رہتے، حتیٰ کہ فیض کی کوئی ایسی رگ چھڑ جاتی کہ غصے میں یا موج میں آ کر ان سے کچھ کہے بغیر رہا نہ جاتا۔

منٹگمری میں فیض صاحب کو اپنی بیوی، بچیوں اور دوسرے دوستوں رشتہ داروں سے ملاقات میں بھی آسانیاں تھیں۔ دل بہلانے کے لیے ہم نے اپنے احاطے کے اندر ایک پھلواڑی بھی بنالی تھی جس کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے سارے جیل میں پھیل گیا تھا بلکہ جیل کے باہر بھی لوگوں کو پھولوں کی پنیری مہیا کی جاتی تھی۔ فیض کو پھولوں کا شوق اتنا تھا کہ انھوں نے ولایت سے اپنی خوشدامن اور ایک دوست کے ذریعے پھولوں کے بیج منگوائے۔ پھول ایک بڑھنے پھولنے پھلنے کی چیز ہے ان سے جیل میں خوب جی بہلتا ہے۔ اور کوئی نہ کوئی نئی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آدمی قید کا ایک ایک دن گننے کی بجائے موسم گننے لگتا ہے جو طویل سے طویل قید میں بھی اُنگلیوں پر

گنے جا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی نظریں مستقبل کی طرف رہتی ہیں کہ آنے والے موسم میں پھول اگانے کے لیے کیا کیا بندوبست کرنا ہے اور گزشتہ غلطیوں کے اعادے سے بچاؤ کی کیا صورت ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود منٹگمری میں فیض صاحب کو قید کا بہت شدید احساس تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حیدرآباد سے تبدیلی پر یاروں دوستوں سے جدائی کا بہت قلق تھا ـــ ایک طرح سے بھرا گھر اُجڑ گیا تھا۔ دوسری وجہ میں بیان کر چکا ہوں کہ کراچی کے دوران قیام کی نسبتاً آزاد فضا کے بعد قید کا بوجھ زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ مستقبل قریب میں رہا ہو جانے کی امید کا جو موہوم سا چراغ اب تک جلتا رہا تھا، وہ اب خاموش ہو چکا تھا۔ اور شروع شروع کی قیدِ تنہائی کا رنگ ایک حد تک عود کر آیا تھا۔ درد و غم کا طوفان اُمڈ پڑا تھا۔ اب وہ جیل کی دیواروں، دروازوں، سلاخوں، پہرہ داروں کو غور سے دیکھنے لگے تھے۔ پہلے باہر کی دنیا کے ساتھ تخیل کا بلاواسطہ

تعلق تھا اب اسے بھی جیل کی دیواریں پھاند کر آنا جانا پڑتا تھا ؎

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطّر آتی ہے، اشکوں سے منوّر جاتی ہے

اس شعر میں نسیمِ صبحِ وطن کی جیل کی دیواروں کو پھاندنے کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی ہے اور اس کا ہجراں نصیب قیدی کو جیل والوں کی نظروں سے بچ بچا کر یادوں کا تحفہ دینا اور اس کے آنسوؤں کی سوغات لے جانا بھی نظر آ رہا ہے۔

جب تک سوہنی کامیابی سے چناب کو عبور کر کے مہینوال سے مل لیا کرتی تھی، اس وقت تک اس کے ذہن میں چناب کی لہروں اور گھڑے کی پختگی کا ایک موہوم تصوّر تھا۔ اس کی ساری توجہ مہینوال پر مرکوز رہتی تھی کہ وہ کیسا ہو گا، کیسے ملے گا اور رخصت کے وقت دل پر کیا گزرے گی۔ جب وہ کچے گھڑے کی بدولت دریا میں ڈوبنے لگی، اس وقت بھی نظریں یار کی کٹیا پر تھیں۔ لیکن کوئی وقت ایسا ضرور

آیا ہوگا۔ جب پوری شدت کے ساتھ اس کو دریا کی ہستی کا احساس ہوا ہوگا اور کچے گھڑے کی چکنی مٹی ہاتھوں میں محسوس کرکے پکا گھڑا بھی یاد آیا ہوگا اور جب وہ مہینوال کی خاطر اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہوگی تو ایک لمحے کے لیے مہینوال کا تصور بھی ذہن سے اُتر گیا ہوگا۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران میں فیض کا تصور باہر کی دنیا کے ساتھ بہت مضبوطی کے ساتھ جما رہا۔ جیل کی زندگی نے یہ رشتہ اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ دستِ صبا کے آخر میں فیض صاحب کی دو حسین و جمیل نظمیں "زنداں کی ایک شام" اور "زنداں کی ایک صبح" اس پر شاہد ہیں۔ یہاں انھوں نے زنداں کے کریہہ المنظر دیو کی ہیبتناکی کا پورا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن ان کے چہرے پر تحقیر آمیز مسکراہٹ ہے اور انھوں نے مسرّت و شادمانی کے ایسے ذرائع نکال لیے ہیں جو زنداں کے عفریت کے احاطۂ قدرت سے باہر ہیں۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنّاتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بے کار شب و روز کی نازک پریاں

اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

کراچی کے قیام کے بعد یہ طلسم ٹوٹ گیا اور منٹگمری میں جیل اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ روبرو آگیا۔ چنانچہ ان کے دردِ دل نے دنیا بھر کے اسیروں کے رنج و الم کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ کینیا کے باشندوں پر جمہوریت اور آزادی کے دعوے داروں کے ہاتھوں بے پناہ ظلم و ستم اور ان کے اپنے وطن کے مصائب فیض صاحب کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے تھے۔ وہ افریقی عورتوں کے کارہائے نمایاں سے خاص طور پر متاثر تھے۔ کئی دفعہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں رہے افریقی بن گئے ہیں۔ ان کی نظم "آجاؤ افریقا" اس کی مظہر ہے۔

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"۔ روزنبرگ (ROSENBERG) جوڑے کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہاں وہ مرتے دم تک انسانیت کے مستقبل، انقلاب

یا محبت یا ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جتلاتے رہتے ہیں۔ اس نظم کی آفاقیت (UNIVERSALITY) عجیب وغریب ہے۔ اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کرکے، ہر ملک کے شہیدوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کربلا، پلاسی، سرنگا پٹم، مدکی، جھانسی، جلیانوالہ، قصہ خوانی، سٹالن گراڈ ملایا، کینیا، کوریا، تلنگانہ، مراکش، طیونس، سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے، اور طہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر دم توڑتے طلبہ، مراکش، طیونس، کینیا اور ملایا کے خون میں لت پت مجاہد، سب ایک ہی جانفروز نعرہ دہراتے سنائی دیتے ہیں:

تیرے کوچے سے چن کر ہمارے عَلَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

ہم منٹگمری میں ہی تھے کہ ایرانی محبانِ وطن کو جیل میں گولی کا نشانہ بنانے کی مفصّل روداد امریکی رسالہ "ٹائم" میں آئی۔ ساتھ ہی ان کی قتل گاہ میں لی گئی تصویر بھی تھی۔ سعدی اور حافظ کے وطن سے فیض صاحب کو خاص محبت ہے۔ کئی دن مضطرب رہے اور بالآخر ان کا اضطراب "آخری رات" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ نظم ان خیالات و تصورات کی ترجمانی کرتی ہے جو قیدی کے ذہن میں اس رات گزرتے ہیں جس کی صبح کو اسے شہید ہونا ہوتا ہے۔ انسانیت کی راہ میں بہے ہوئے خون کی کرشمہ سازیاں دیکھیے، شہداء کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں نئے روپ دھار لیتے ہیں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

فیض صاحب کی اس زمانے کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی اگر کوئی نظم کرتی ہے تو وہ "دریچہ" ہے۔

منٹگمری سے دانتوں کے علاج کے سلسلے میں کوئی تین ہفتے کے لیے مارچ ۱۹۵۴ء میں ہمیں لاہور آنا پڑا۔ لاہور سے فیض صاحب کو والہانہ محبت ہے۔ وہ لاہور آنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے دل پہ بار گزرے گا۔ یہاں آکر لاہور کا پانی پیا۔ اس کی فضا میں سانس لیا، لاہور کی آوازیں سنیں اور لاہور کے بعض گاموں ماجھوں سے جو ختمِ نبوّت کی تحریک کے سلسلے میں جیل میں آئے ہوئے تھے، ملاقات ہوئی اور اس دلدوز نظم "اے روشنیوں کے شہر" کا ظہور ہوا، جس پر کوئی شہر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔

فیض صاحب کے دل میں لاہور اور لاہور والوں کی محبت کا جوش ایک دفعہ پہلے بھی اُمڈ پڑا تھا جب ۱۹۵۳ء میں لاہور کے گلی کوچے اس کے فرزندوں کے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔ "لاہور کے نام" ابھی تک ادھوری ہے۔

منٹگمری میں ان کی شاعری کے بارے میں میری اور ان کی

کافی بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی۔ میں کوئی نہ کوئی بات کہتا رہتا تھا اور ان کو جواب دیئے بغیر چارہ نہ تھا۔ شاعر اور ماعر والا معاملہ تھا۔ راہ مفر ایک ہی تھی کہ سرکار کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے مجھ سے نجات پاتے۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہذا مرتا کیا نہ کرتا۔ آج کل بھی مذاقاً کہا کرتے ہیں کہ "زنداں نامہ" کے زنداں نامہ ہونے میں تمہاری "وہابیت" کو بھی دخل ہے۔

فیض کی جیل کی شاعری میں وطن کی محبت کے چشمے ہر طرف پھوٹ رہے ہیں۔ وہ جا بجا اپنے دیس اور اس کے باسیوں کی خستہ حالی قوم کی عزت و ناموس کی ارزانی، لوگوں کی ناداری، جہالت، بھوک اور غم کو دیکھ دیکھ کر بے طرح تڑپ رہے ہیں۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

بعض دفعہ کچھ اور نہیں بنتا تو خالی پلاؤ پکانے لگتے ہیں، اور جیل کی کال کوٹھڑی میں بیٹھ کر بھی گرد آلود، پریشاں حال لیلائے وطن کو بنا سنورا دیکھنا چاہتے ہیں:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

وطن کی محبت اس طرح ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے کہ اب اس کا دوسری محبتوں سے علٰحدہ کر کے دیکھنا ناممکن ہو گیا ہے

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

زنداں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ہم سب کی حب وطن معمول سے زیادہ جوش پر تھی۔ صبح شام پاکستان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ بے بسی نے مزاجوں میں چڑچڑا پن پیدا کر دیا تھا۔ کبھی غضبناک ہو جاتے تھے کبھی گریہ وزاری کو جی چاہتا تھا۔ دست و پا تو ناکارہ کر دیئے گئے تھے لیکن دل و جاں پر آفت آئی ہوئی تھی۔

۱۹۵۱ء میں جب ہندوستان کے پاکستان کی طرف جارحانہ ارادوں کی خبریں شائع ہوئیں تو ہم میں سے ان افسروں نے جو ابھی تک معزول نہیں کیے گئے تھے، گورنمنٹ کو درخواست دی کہ پاکستان کی حفاظت میں ہم کو بھی جان لڑانے کی اجازت دی جائے، خاص طور پر جبکہ ہر ایک کو کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنے کا تجربہ ہے۔ درخواست میں واضح کر دیا گیا تھا کہ ہمارا مقصد مقدمے سے جان چھڑانے

کا نہیں۔ ہم گورنمنٹ سے سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتے کہ ہنگامی حالات کے دوران میں مقدمے کو ملتوی کر دیا جائے۔ یہ کوئی سٹنٹ (STUNT) بھی نہیں تھا، اس لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ ہندوستانی فوجوں کے شانہ بشانہ ہندو سبھائی اور اکالی درندے بھی ہوں گے اور مغربی پاکستان سے کوئی راہِ مفر نہیں تھی۔ ہماری درخواست مسترد کر دی گئی۔ بہرحال زمانہ کھرے کھوٹے کی تمیز زود یا بدیر کر ہی لے گا۔

نظیری کاش بنمائی کہ در ساغر چہ مے داری
کہ پیشِ زاہداں قدرِ گنہگاراں شود پیدا

ہندوستان اور پاکستان کا ذکر چل نکلا ہے۔ جیل میں فیض صاحب اکثر اپنے ہندوستانی دوستوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ ان میں کئی ایک لاہور کے رہنے والے تھے۔ کئی دوسرے سالہا سال تک پنجاب میں رہ چکے تھے۔ مولانا حسرت موہانی، رشید جہاں، صاحبزادہ محمود الظفر،

اسرارالحق مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، پنڈت ہری چند اختر
اپندر ناتھ اشک اور ان کی بیگم، ملک راج آنند، کرشن چندر، ڈاکٹر
اشرف، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے
کئی اصحاب کا ذکر میں نے اتنی دفعہ سنا ہے کہ محسوس کرتا ہوں کہ
ان کے ساتھ ایک عرصہ سے جان پہچان ہے، حالانکہ ان میں سے
میں کسی ایک کو بھی ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ سجاد ظہیر اور فیض اکٹھے
ہو جاتے تھے تو پھر باتیں ہی اکثر ان لوگوں کے بارے میں ہوا
کرتی تھیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ فیض صاحب نے لاہور
میں گزارا تھا۔ انہی دنوں وہ مشرقی پنجاب بھی ہو آئے تھے۔ طرفین کے
بہادروں اور سورمیروں نے جس طور پر انسانیت کو ذلیل کیا تھا،
اس کا آنکھوں دیکھا حال اکثر سنایا کرتے تھے۔ بیان کرتے کرتے
رقت طاری ہو جاتی اور رک جاتے۔ میرے خیال میں وہ اتنے بڑے

پیمانے پر اس تفصیل سے اس ہولناک خانہ جنگی کو دیکھنے پر مجبور رہے ہیں
کہ شعروں میں اس کو لانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ وقت
ملنے پر وہ ناول یا ڈرامے کے ذریعے پنجاب کی اس ٹریجڈی کو بیان
کریں۔ پنجاب کی سرزمین یوں تو ہزاروں سالوں سے حملہ آوروں کی
تاخت و تاراج کا شکار رہی ہے۔ یہاں کی کوئی نسل ایسی گزری ہوگی
جس نے غیر ملکی گھوڑوں کے سُموں کی ٹاپ نہ سنی ہو۔ لیکن ان
حملہ آوروں میں سے اکثر بگولے کی طرح آتے تھے اور آندھی کی طرح
گزر جاتے تھے۔ تلوار کے سائے تلے جینے کی ذلّت کچھ کم نہیں ہوتی لیکن
۱۹۴۷ء میں جس طرح پنجابیوں نے پنجابیوں کو ذلیل و خوار کیا، تمام
حملہ آوروں نے مل کر بھی نہیں کیا ہوگا۔ امرتا پریتم کے الفاظ میں:

اَج آکھاں وارث شاہ نوں کتھوں قبراں وچّوں بول
تے اَج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول
اِک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اَج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

اُٹھ دردمنداں دیا دردیا، اُٹھ تک اپنا پنجاب
اَج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب
کسے نے پنجاں پانیاں وِچ دِتّی زہر رلا
تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دتا پانی لا

....

دھرتی تے لہو وسّیا قبراں پیّاں چون
پریت دیاں شہزادیاں اج وچ مزاراں رون
اَج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اَج کتھوں لیائیے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

....

فیض صاحب پاکستان میں بعض اصحاب کے اس نظریے پر بہت رنجیدہ خاطر ہوا کرتے تھے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلّق ہندوستان سے بھی ہے پاکستان کے لیے زہرِ ہلاہل ہے۔ ریڈیو پر سوائے اقبال کے کلام کی

قوالیوں اور فلمی گانوں کے کچھ سننے میں نہیں آتا۔ چنانچہ ہم جیل والوں سے بچ بچا کر، ہندوستانی ریڈیو سٹیشنوں سے اپنے دیس کے راگ سنا کرتے تھے۔ کسی جاہل نے بزعمِ خود قومی جوش میں آکر امیر خسرو، تان سین، واجد علی شاہ، عبدالکریم خاں، فیاض خاں اور دوسرے بیسیوں اساتذہ اور زعمائُ سے پاکستان کا رشتہ توڑنے کو عین حب الوطنی سمجھ لیا تھا۔

ملکوں کی سیاسی و اقتصادی حدیں وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ایک خطۂ زمین کے کلچر، زبان، ادب، آرٹ، موسیقی، فنِ تعمیر اور دوسری ثقافتی قدروں کا قوام سیکڑوں، ہزاروں سالوں کی ریاضت کے بعد تیار ہوتا ہے اور اس کی بنیادی ترکیب میں تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔ پاکستان اور ہندوستان میں سیاسی دھینگا مشتی کیسی بھی صورت اختیار کر جائے دلّی، لکھنؤ، حیدرآباد اور لاہور کی گنگا جمنی تہذیبیں اپنی جگہ قائم رہیں گی اور میر اور غالب ہیں سب کی

سانجھی رہے گی۔ ہندوستانی اور پاکستانی تہذیبوں کے درختوں کی جڑیں موہنجو دھارو، گیا، ہرش پور، گندھارا، ٹیکسلا، متھرا، بنارس، اجنتا، اجمیر، قطب مینار، تاج محل، جامع مسجد، شالامار ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں شاخوں میں کہیں سمرقند و بخارا اور کہیں عرب و عجم سے آئے ہوئے پیوند اپنی بہار دکھا رہے ہیں اور کہیں پراچین ڈالیں جوں کی توں قائم ہیں۔ دوسرے کی ضد میں جڑوں کو نقصان پہنچانا یا شاخوں کی نوچ کھسوٹ کرنا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔

فیض صاحب اُن انسانیت نواز روایات سے تعلق رکھتے ہیں جو ہزاروں سالوں سے دونوں ملکوں کی سرزمین کا خاصہ رہی ہیں وہ اسی سلسلے کی کڑی ہیں جسے امیر خسرو، بھگت کبیر، خواجہ معین الدین چشتی بابا نانک، بابا فرید، ابوالفضل، فیضی، بُلھے شاہ، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمان بابا اور دوسرے بہت سے بزرگوں نے فیض بخشا ہے۔

حیدرآباد میں ان کا درس و تدریس کا سلسلہ عجب، متنوع قسم کا تھا۔ کوئی قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس لے رہا ہے۔ تو کوئی صوفیائے کرام کی تصانیف فتوح الغیب، کشف المحجوب، احیاء العلوم وغیرہ کے رموز و نکات سمجھ رہا ہے۔ کوئی انگریزی اور یورپین ادب کی الجھنیں پیش کر رہا ہے تو کسی نے مارکسی جدلیاتی فلسفے پر بحث شروع کر رکھی ہے۔ اردو فارسی ادب تو تکیۂ کلام تھا۔ حیدرآباد میں ہم نے ان کو شاگرد کے رول میں بھی دیکھا ہے۔ پوشنی کے ساتھ مل کر سید سجاد ظہیر سے فرانسیسی زبان سیکھا کرتے تھے۔ نہایت غبی اور کام چور تھے۔ سید صاحب کی استادانہ گھرکیاں اور فیض صاحب کی بہانہ سازیاں بہت لطف پیدا کرتی تھیں۔

محنت کشوں سے انھیں خاص الفت ہے۔ حیدرآباد میں ایک بار ہمارے احاطے میں بجلی کے کھمبے کا فیوز (FUSE) جل گیا۔ ایک مستری بغیر سیڑھی کے وہاں پہنچ گیا۔ ہم تلملانے لگے کہ خواہ مخواہ

وقت ضائع کرنے کے لیے آگیا ہے۔ اس نے کھمبے کو ذرا سا ٹھونکا بجایا اور یہ جا وہ جا بغیر سیڑھی کے کھمبے کے سر تک پہنچ کر آنکھ جھپکنے میں نیا فیوز لگا آیا۔ فیض صاحب دیر تک اس کے قصیدے پڑھتے رہے۔ منٹگمری میں شاہ جی، ایک پوسٹ مین، ہمارے پارسل وغیرہ لایا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر فیض صاحب کی آنکھوں میں جس قسم کی روشنی آجایا کرتی تھی وہ میں نے کم ہی دیکھی ہے۔ دونوں ٹریڈ یونین کے ممبر رہ چکے تھے کہا کرتے ہیں ہندوستان پاکستان کے مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ دونوں ملکوں میں محنت کش اپنے حقوق حاصل کرکے اپنے اپنے چمنستانوں کے والی بن جائیں۔ اس کے بعد ان ملکوں کے درمیان نفرت کا زہر اور اس کو پیدا کرنے والے حل طلب مسائل، جن کی آڑ میں سامراجی آجکل اپنے آہنی پنجے وطنِ عزیز کی رگوں میں دوبارہ پیوست کر رہے ہیں، یوں غائب ہو جائیں گے جیسے دیووں پریوں کے قصوں میں ہیرو کے اسمِ اعظم پڑھنے پر دیو بھوت اور دوسری بلائیں آناً فاناً رفع دفع

ہو جاتی ہیں۔

فیضؔ کی شاعری میں ایک صاحبدل کا جوش اور ولولہ ہے۔ اس میں قوم کی قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ لیکن شاید کیا بات کہ اس کے قوام میں پاکستان کے محنت کشوں کا مبارک پسینہ اور خون کی حرارت ابھی تک پوری مقدار میں شامل نہیں ہیں۔ سمن و گلاب کو جس چاہت سے یاد کیا ہے۔ اسی چاہت اور تفصیل سے اس بدحال بدنصیب کا ذکر نہیں ہے، جس نے سمن و گلاب کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر شاداب کیا ہے اور جس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی ان سمن و گلاب کی نزاکتوں، رنگ روپ اور عطر بیزیوں سے مستفید ہو سکے۔ ان کا دل تو ادھر کھنچا جا رہا ہے۔ لیکن

لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی

ان کی شاعری کو ڈرائنگ روموں، سکولوں، کالجوں سے

نکل کر سڑکوں، بازاروں، کھیتوں اور کارخانوں میں ابھی پھیلنا ہے۔

وہ کہا کرتے ہیں کہ یہ چیز صرف پنجابی میں ہو سکتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں یہ اُن کی معمول کے مطابق کسرِ نفسی ہے اور جبلی ہچکچاہٹ۔ "دستِ صبا" کے ابتدائیہ میں انھوں نے فرمایا ہے "یا یوں کہیے کہ شاعری کا کام صرف مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اس کو دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا، اِس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر ـــ" اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے ہیں۔" آگے فرمایا ہے کہ "حیاتِ انسانی کی اجتماعی جد و جہد کا ادراک اور جد و جہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں۔ فن کا بھی تقاضا ہے۔" زنداں نامہ، اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ فیض کے مشاہدہ اور مجاہدہ کے تناسب میں مجاہدہ کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے اور یہی اس وقت ان کے فن کا تقاضا بھی معلوم ہوتا ہے۔

اب ان کی نظریں لاہور کے مناظر سے اُٹھ کر پاکستان کے وسیع میدانوں پر پڑنے لگی ہیں۔ جہاں بے شمار انسان نما مٹی کے تودے صدیوں سے ایک ہی طرح کی دھیمی دھیمی حرکت کر رہے ہیں۔ اب ان تودوں کی کمریں کچھ سیدھی ہو رہی ہیں۔ ان کو اس بوجھ کا احساس ہو رہا ہے جو انھوں نے قرنوں سے اٹھا رکھا ہے۔ کیونکہ ان پر آہستہ آہستہ یہ بھید کھل رہا ہے کہ بعض دوسرے دیسوں میں ان کے بھائی بندوں نے یہ بوجھ اتار دیا ہے اور وہ لوگ اب انسانی عظمت میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک طرح کا نور ہے کیونکہ وہ دور افق پر زندگی اور توانائی کی اٹھتی، گرتی گھٹتی بڑھتی روشنی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ کسی برہا کی ماری کی طرح جو اچانک اپنے پریتم کو نزدیک آتا دیکھے، ابھی تک لجا رہے ہیں، شرما رہے ہیں اور اپنی کم مائگی اور پریشان حالی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ فیض صاحب کی نظریں کارخانوں میں بھی گھس رہی ہیں، جہاں کسانوں کے ساتھی مزدور

انسان کی تخلیقی قوت اور اس کی عظمت کا درس حاصل کر رہے ہیں فیض صاحب یہ سب کچھ خود ہی نہیں دیکھ رہے اپنے لاہوری بھائی بندوں، دماغی مزدوری کرنے والے مصنّفوں، کلرکوں، چھوٹے دکانداروں، وکیلوں، ٹیچروں، طالب علموں، گاموں اور ماجھوں کو بھی دکھلا رہے ہیں اور پکار رہے ہیں کہ کارگہِ ہستی میں جو رن پڑا رہا ہے، اس میں حق و باطل کے لشکروں کو پہچانو "ناداری" دفتر، بھوک اور غم" نے جو یکھ بتھراؤ کر کے تمہارے ساغرِ دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور تمہاری عزّت اور ناموس خاک میں ملا دی ہے، صہبائے غمِ جاناں کی پری کی بے حرمتی کر دی ہے۔ لیکن

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

....

اب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکائے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو
نیلام چڑھائے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پہ

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے پھرتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں

سب ساغر شیشے لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

"زنداں نامہ" میں فیض صاحب نے حق و باطل کی اس ہولناک جنگ میں بہادروں کی بہادری کے واقعات کا تذکرہ شروع کر دیا ہے اس کی ابتدا وہ "دستِ صبا" میں "ایرانی طلبہ کے نام" لکھ کر کر چکے ہیں لیکن ابھی تک ان کی یہ عادت پوری طرح نہیں گئی کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کے دھوئیں کے پہلے مرغولہ (PUFF) کو ہی لے بیٹھتے ہیں۔ اور جب یہ دھواں ہوا کے جھونکوں سے چشم زدن میں تتر بتر ہو جاتا ہے تو رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ یا طوفان کی پہلی موج میں ہی محوِ تماشا ہو جاتے ہیں اور جب اسے ساحل کی ریتی میں جذب ہوتا دیکھتے ہیں تو فرطِ درد سے بے حال ہو جاتے ہیں یا بڑھتے ہوئے لشکر کے سب

سے اگلے سکاؤٹ جب کھیت ہو جاتے ہیں۔ تو اُن کو تڑپتا دیکھ کر
تمام نظامِ کائنات کو آگ لگا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے درد کی فراوانی
ہر نیک دل کا خاصہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر آتش فشاں زمیں دوز گرج کو
سنا جائے اور اس کے چند لمحوں میں اُبلنے والے کروڑوں من لاوا کا
تصوّر کیا جائے یا پہلی لہر کے پیچھے بپھرے ہوئے بے کنار سمندر کا
خیال کیا جائے یا پہلے اسکاؤٹوں کے عقب میں بے پناہ لشکرِ جرّار
کو بھانپا جائے تو دھوئیں کے پہلے مرغولہ کے بکھرنے، طوفان کی پہلی لہر
کے جذب ہو جانے اور اسکاؤٹوں کے مرنے میں درد و غم کی جگہ مجاہدانہ
تڑپ آجاتی ہے۔ زندگی کے سائے گہرے ہونے کی بجائے اس کی
رنگینیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان تینوں کی موت پر رونے دھونے کی
بجائے ان کی یادگار منانے کو جی چاہتا ہے۔ وہ عشق و محبت کے
پہلے کُشتے ہی نہیں فتح کے بانی بھی ہیں اور ان کی موت زندگی کا رس
ہے۔ فیض صاحب کا کینوس ذرا اور وسیع ہو جائے تو بلاشبہ ہمارے

ادب کے گورکی بن جائیں گے۔ ان سے زیادہ اس رتبہ کا اور کون مستحق ہے؟ بدقسمتی سے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ان میں رجز خوان ایک جان کے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے؟

منٹگمری میں میری ایک ڈیوٹی فیض صاحب کے لیے سامعین فراہم کرنا تھی۔ اس کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ میں ان کا تازہ کلام سیّد سجاد ظہیر صاحب کو مچھ جیل میں اور عطا اور پوشنی کو حیدرآباد بھیج دیا کرتا تھا۔ سیّد سجاد ظہیر کے ایک خط کا اقتباس اس مضمون کے اختتام کے لیے بہت مناسب رہے گا۔

سنٹرل جیل

مچھ بلوچستان۔ ۲۱ فروری ۵۴ء

"..... آئندہ میں زیادہ باقاعدگی سے تمہارے خطوں کا جواب دوں گا۔ اس ارادے میں صرف اخلاقی فرض ہی کا تقاضا نہیں بلکہ میری خود غرضی بھی شامل ہے۔ تمہارے خطوں سے دوستی اور التفات کی لطیف

مہک آتی ہے۔ جس سے رنجور دل کو بے انتہا ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اس طرح ہم تنہائی میں گفتگو کر لیتے ہیں، ہنس بول لیتے ہیں۔ تھوڑی بہت فلسفیانہ اور ادبی موشگافیاں کر لیتے ہیں اور آہنی دیواروں میں کسی قدر رخنہ ڈال کر جیسے نکلتے ہوئے سورج کی کرنوں سے ذرا دیر کے لیے دل و دماغ کو منوّر کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ تم فیض کے کلام کے تحفے بھی بھیجتے ہو اور اب کی تو تم نے اس کے انبار لگا دیئے ہیں، ان کے لیے فیض کا اور تمھارا بہت بہت شکریہ۔ یہ تو ایسا عطیّہ ہے جس کا عوض مجھ سے کبھی ادا ہی نہیں ہو سکتا۔

فیض کی نظم "ملاقات" مجھے پسند آئی ہے۔ اس میں علائم کی مرصّع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرعے سے شروع ہو کر (یہ رات اس درد کا شجر ہے) نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک ایسا ہے جو اپنی جداگانہ خوشبو اور رنگ بھی

رکھتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ اور متوازن بھی ہے، پھر نظم کا بنیادی خیال پوری تخیل کے ساتھ بڑی کامیابی سے ملایا گیا ہے، جیسے ایک حسین اور نازک جسم میں دردمند، حساس اور لطیف روح ہو۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محن، غمناکی، شدتِ درد اور ان سب کے باوجود، بلکہ ان کے وسیلے سے نمودار ہونے والی "نئی سحر" کے تصور کو گرفت میں لانے کے بعد شاعر نے اسے نظم کا جامہ پہنایا ہے، بلکہ یہاں پر یہ بلند ہمت آور خیال اور تصور جیسے شاعرانہ تخیل کا ثمر ہے اور پوری نظم کے گلدستے سے دل آویز اور روح افزا رنگینیوں اور نکہتوں کے ساتھ جھک پڑا ہے، تیسرے بند کے شروع کے چار مصرعے جہاں سے گریز کیا گیا ہے، اپنی فصاحت، موسیقیت، روانی اور زورِ کلام کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انھیں ایک بار پڑھ لو تو دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور پھر بھولتے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اتوار کی صبح کو کسی کلیسا کی گھنٹیاں لہک لہک کر بج رہی ہوں

اور ان کی مسلسل آواز صرف سامعہ میں نہیں بلکہ سارے جسم کے پوروں میں سرایت کر رہی ہو۔ فیض کی شاعری کا "رنگ" لوگ جس بات کو کہتے ہیں اس میں لہجے کی دردناکی اور فضا کی نرمی ایک خاص چیز ہے۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ ان مصرعوں میں وہ رنگ نہیں ہے۔ اچھے اور بڑے شاعر اپنا رنگ ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں گو وہ اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔

"..... تم نے اپنے گذشتہ خط میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اب انھیں ہمت کر کے ایک جست لگانی چاہیے، تاکہ ان کی شاعری میں خوشبوؤں اور گل بیزیوں کے علاوہ خلقِ خدا کے اس مبارک پسینے اور خون کی حرارت کی آمیزش بھی ہو، جس سے فی الحقیقت زندگی بنتی بدلتی اور سنورتی ہے۔ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔ البتہ میں انھیں ایسا کرنے کے لیے دھکا نہیں دینا چاہتا...... ان امید افزا علامات کے سبب سے جو حالیہ نظموں اور غزلوں میں خود ہی نظر آ رہی

ہیں، جو کہ صحیح جمہوری سمت کا پتہ دیتی ہیں۔

میرے خیال میں وہ خود اس نکتہ کو سمجھتے ہیں۔ پنجاب کی سرزمین صدیوں پہلے بابا فرید، وارث شاہ، بُلھے شاہ کی ذاتوں میں، دوسرے حالات اور دوسرے ماحول میں، ایسی جمہوری شاعری پیدا کر چکی ہے، ہمارے یہاں کبیر، تلسی، سُور ہو چکے ہیں۔ ایسے نغمے پھر کیوں نہیں چھیڑے جا سکتے۔

ان نئی غزلوں پر ان کو مبارک باد دینا، گو یہ صحیح ہے کہ داد مرزا جعفر علی خاں سے ہی لینا چاہیے، میں تو اب برائے نام لکھنؤ کا رہ گیا ہوں۔ چھ سال پنجاب میں اور پنجابیوں کے ساتھ رہ کر اللہ ہی جانتا ہے کہ زبان کتنی "بگڑ" گئی ہے۔ شاید چونکہ موسم بہار کا ہے۔ اس لیے ہمیں "گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے" والی غزل سب سے اچھی لگی اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمھارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جس غزل کو تم نے واسوخت کا عنوان دیا ہے۔ وہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہے۔ ایک ایک شعر نشتر ہے۔ کس کس کی تعریف کریں۔ خاص طور پر یہ شعر

گردنِ کرِ زخم کی تو خطا کار ہیں گئے ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

اس کی داد تو فیض مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے۔ جعفر علی خاں اثر تو الگ رہے ....."

اے ساکنانِ کُنجِ قفس! صبح کو صبا

سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار، کچھ کہو!

سوداؔ

○

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

تھے شبِ ہجر، کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

○

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو فیضؔ، جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

اے حبیبِ عنبر دست!

[ایک اجنبی خاتون کے نام
خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر]

کسی کے دستِ عنایت نے کُنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دل نواز بند و بست
مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گل بدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست

لٹے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

یہ شعرِ حافظِ شیراز، اے صبا! کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست
"خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی
بجز بنائے محبّت کہ خالی از خلل است"

سنٹرل جیل۔ حیدرآباد
۲۸-۲۹ اپریل ۵۳ء

○

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جُرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارہ، اب اُن کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیِ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

اِدھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

حیدرآباد جیل
۱۷-۲۲ مئی ۵۴ء

شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اُٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

جناح ہسپتال کراچی
جولائی ۵۳ء

○

رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حُسنِ یار کرتے رہے

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم اُن سے رشتۂ دل اُستوار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم اُن میں تیرا سِوا انتظار کرتے رہے

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخنِ راز دار کرتے رہے

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

اُنھیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

جناح ہسپتال کراچی
۲۱ر اگست

ملاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اِسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے

گِرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اِسی سیاہی میں رُونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نُور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)

کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۳)

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کِھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے

یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

منٹگمری جیل
۱۲؍اکتوبر۔ ۳؍نومبر ۵۳ء

○

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گذر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

٭

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے

اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے
اب طبیعت بہل چلی ہے

اشک خوناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے

یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے

لاکھ پیغام ہو گئے ہیں
جب صبا ایک پل چلی ہے

جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چلی ہے

منٹگمری جیل
۲۱ر نومبر ۵۳ء

واسوخت

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی
ہاں، ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

کیوں دادِ غم، ہمیں نے طلب کی، بُرا کیا
ہم سے جہاں میں کُشتۂ غم اور کیا نہ تھے

گر فکرِ زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے، بہت لادوا نہ تھے

لب پر ہے تلخیٔ مئے ایّام، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

منٹگمری جیل
۲۴ر نومبر ۵۳ء

(۶)

شاخ پر خونِ گُل رواں ہے وہی
شوخیٔ رنگِ گلستاں ہے وہی

سرو وہی ہے تو آشیاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یارِ مہرباں ہے وہی

برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

چاند تارے اِدھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

منٹگمری جیل

٭

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

منٹگمری جیل

○

ہم پر تمھاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و اُلفتِ ناکام ہی تو ہے

دل مدّعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل نا اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات فیضؔ غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

منٹگمری جیل
۹ مارچ ۵۴ء

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ، سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

بستا ہے اِس کُہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اُونچی رکھیں لَو

لاہور جیل
منٹگمری جیل
۲۸ مارچ | ۱۵ اپریل
سنہ ۵۴ء

○

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمھارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گذری سو گذری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیضؔ، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

منٹگمری جیل
۲۹ر جنوری سنہ ۵۴ء

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

[ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے
خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی]

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی

دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عشّاق کے قافلے

جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل
۱۵ر مئی ۵۴ء

○

فکرِ سود و زیاں تو چھوٹے گی
منّتِ این و آں تو چھوٹے گی
خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

○

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصّے کی اب جام میں کمتر جاتی ہے

یوں عرض و طلب سے کب اے دل، پتھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خُو ڈالو، کب خوئے ستمگر جاتی ہے

بیداد گروں کی بستی ہے یاں، داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اب کوچۂ دلبر کا رہرو، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطّر آتی ہے، اشکوں سے منوّر جاتی ہے

منٹگمری جیل
۱۷ر جون ۵۴ء

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لیے

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتلِ مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

منٹگمری جیل
دسمبر ۵۴ء

درد آئے گا دبے پاؤں .....

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آلے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں، لیے سُرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہوگا

جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمنِ جاں ہیں سبھی سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

لاؤ، سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرّار کہاں سے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں سے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر

ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

منٹگمری جیل
یکم دسمبر ۵۴ء

○

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رخسار کی پھوہار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

AFRICA COME BACK*

(ایک رجز)

آجاؤ، میں نے سُن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہوگئی میرے لہو کی تال
"آجاؤ افریقا"

* افریقی حریت پسندوں کا نعرہ

آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اُٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال

"آجاؤ افریقا"

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال

"آجاؤ افریقا"

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

"آجاؤ ایفریقا"

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال

میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال

"آجاؤ ایفریقا"
آؤ ببر کی چال
آجاؤ ایفریقا

منٹگمری جیل
۱۴ جنوری ۵۵ء

○

گرمیٔ شوقِ نظارا کا اثر تو دیکھو
گُل کھِلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہگزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے تمھیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے
اِک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی اُن کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق
فیضؔ، تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو!

منٹگمری جیل
۴ر مارچ ۵۷ء

یہ فصل امیدوں کی ہمدم

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بیکل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو

یہ فصل امیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت، صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی

کھیتی کے کونوں، کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو

پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اُجڑنا ہے
اِک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

منٹگمری جیل
۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء

بنیاد کچھ تو ہو

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اِتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا

رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلّاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

منٹگمری جیل
۱۳ر اپریل ۵۵ء

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے!

یاد کی راہگزر جس پہ اِسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمھیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو

سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہگزر
پھر اسی طرح جہاں ہوگا مقابل پیہم
سایۂ زلف کا اور جنبشِ بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے،
یاں کوئی موڑ کوئی دشت کوئی گھات نہیں
جس کے پردے میں مرا ماہِ رواں ڈوب سکے
تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

اگست ۵۵ء

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے
لطف کر، اے نگہِ یار، کہ غم والوں نے
حسرتِ دل کی اُٹھائی نہیں تمہید اب کے
چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

دل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا، نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عیداب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

کراچی
۱۴ر اگست ۵۵ء

اگست ۵۵ء

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے
لطف کر، اے نگہِ یار، کہ غم والوں نے
حسرتِ دل کی اُٹھائی نہیں تمہید اب کے
چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

دل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا، نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

کراچی
۱۴ اگست ۵۵ء

○

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت دامن
رند میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے

ہوسِ مطرب و ساقی میں پریشاں اکثر
ابر آتا ہے کبھی ماہِ تمام آتا ہے

شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے

اب بھی اعلانِ سحر کرتا ہوا مست کوئی
داغِ دل کر کے فروزاں سرِ شام آتا ہے

لاہور
مارچ ۱۹۵۶ء

ناتمام

○

تمام شب دلِ وحشی تلاش کرتا ہے
ہر اک صدا میں ترے حرفِ لطف کا آہنگ
ہر ایک صبح ملاتی ہے بار بار نظر
ترے دہن سے ہر اک لالہ و گلاب کا رنگ

○

تمھارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر
تمھاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے
رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمھاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

۱۹۵۱
حیدرآباد جیل

○

کھلے جو ایک دریچے میں آج حسن کے پھول
تو صبح جھوم کے گلزار ہو گئی یکسر
جہاں کہیں بھی گرا نور اُن نگاہوں سے
ہر ایک چیز طرحدار ہو گئی یکسر

جناح ہسپتال
کراچی

○

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رخسار ہے کون

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلفِ طرحدار ہے کون

پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانئے پھر دلِ وحشی کا طلبگار ہے کون

جناح ہسپتال کراچی
جولائی ۵۳ء

○

تری امید، ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہمکلام کب سے ہے

لاہور
مارچ ۵۷ء

○

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عشّاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں اِن مہینوں میں